عبداللہ حسین کے ناول ''نادار لوگ'' کا تنقیدی تجزیہ

(سیاسی و سماجی تناظر میں)

عارف صدیق

Araf Saddique

Ph.DScholar, Department of Urdu,
University Of Sargodha, Sargodha.

ڈاکٹر عبدالعزیز ملک

Dr. Abdul Aziz Malik

Lecturer, Department of Urdu,
Govt College University, Faisalabad.

Abstract:

In the post-colonial age many political and social changes occured . The exploitation of the poor by exploiting business on a social level as well as political turmoil increased to the peak.Abdullah Hussain's novel "NADAAR LOG" reflects the different socio -political aspects of post colonial age. An effort has been made to show these aspects through this article.

۱۹۴۷ء میں برصغیر کا دو آزاد مملکتوں میں تقسیم ہو جانا تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ یہ واقعہ اپنے ساتھ کتنے اندوہ ناک واقعات کو جنم دیتا چلا گیا۔ اردو ادب میں فسادات کے حوالے سے لکھی گئی تحریروں سے اس کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ نو آبادیاتی عہد کا خاتمہ وقت کے جس موڑ پر ہوا اور جس طرح ہوا اس نے برصغیر کے باشندگان کو ایک طرف تو آزادی کی دولت سے ہمکنار کیا تو دوسری طرف بہت سے ایسے مسائل کو بھی جنم دیا جو پس نو آبادیاتی عہد میں اس معاشرے کی اقدار اور اس مملکت کو دیمک کی طرح چاٹتے چلے گئے۔ اردو ادب خاص طور پر ناول اور افسانہ نگاری میں ہجرت، فسادات اور پس نو آبادیاتی عہد کے مسائل کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا اور تا حال یہ سلسلہ جاری ہے۔

عبداللہ حسین کا ناول ''نادار لوگ'' (۱۹۹۶ء) بھی پس نو آبادیاتی عہد میں سماجی رویوں اور اقدار کے ساتھ ساتھ معاشرے کے پسے ہوئے طبقے کے استحصال کو نمایاں کرنے کی ایک اہم کاوش ہے۔ ناول ''نادار لوگ'' کے موضوعات اور دیگر امور پر بحث کرنے سے قبل مناسب ہوگا کہ ''نادار لوگ'' کی کہانی کے دورانیہ پر بات کر لی جائے تاکہ ناول کے ذریعے اس عہد کو سمجھنے اور بحث کی حدود کا تعین کرنے میں آسانی رہے۔ نادار لوگ کے زمانی دورانیہ کے حوالے سے محمد عاصم بٹ لکھتے ہیں:

''نادار لوگ'' کا زمانی منظر نامہ ۱۸۹۷ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیانی عرصے میں پھیلا ہوا

ہے۔ ناول کا زیادہ حصہ ۱۹۴۷ء کے بعد ملک کے حالات وواقعات پر مبنی ہے۔ اس دوران میں ملک کی زندگی میں جو اہم واقعات سیاست یا سماجی زندگی کی سطح پر رونما ہوئے اور ان کے عام لوگوں کی زندگیوں اور سوچوں پر کیا اثرات مرتب ہوئے انھیں ناول میں زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ یوں پاکستان کی تاریخ، ادب کے تناظر میں ہمیں اس ناول میں ملتی ہے۔''(۱)

''نادار لوگ'' کا زمانی منظر نامہ ۱۸۹۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ضرور ہے مگر یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس ناول کی اصل کہانی کا محور ۱۹۴۷ء کے بعد کا دور ہے۔ اس سے پہلے کے حالات وواقعات ناول کے پلاٹ کی تشکیل میں ایک بنیاد کے طور پر لیے گئے۔ خود عبداللہ حسین نادار لوگ کے زمانی دورانیے کے حوالے سے کہتے ہیں:

''یہ ایک مخصوص عہد کا احاطہ کرتا ہے جو ستتر برسوں پر محیط ہے یعنی ۱۸۹۷ء سے ۱۹۴۷ء تک لیکن ۱۸۹۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کا جو وقت ہے وہ صرف اس کا پس منظر ہے۔ بنیاد ہے .... یوں میرے اس ناول کی بنیادیں پہلے پچاس سال میں بنتی ہیں۔ وہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۴ء تک کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ ہمارے ملک کا ایک بہت ایونٹ فل عرصہ تھا وہ اس کے ساتھ اسے بھی ڈیل کرتا ہے۔''(۲)

عبداللہ حسین کے اس بیان کو سامنے رکھ کر اگر ۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۴ء کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ عرصہ واقعی پاکستان میں ایک ایونٹ فل عرصہ تھا۔ اس ملک کی آزادی کے آغاز سے ہی بہت سے مسائل سامنے آنے شروع ہو گئے تھے۔ مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ، اثاثہ جات کی تقسیم کا مسئلہ، اقتصادی مسائل، انتظامی مسائل ایسے مسائل تھے جنھوں نے روزِ اول سے ہی اس مملکت کی جڑیں کھوکھلی کرنا شروع کر دی تھیں۔ حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھا جائے تو ان مسائل کی بڑی وجہ کانگریس کی پالیسیاں اور جانبدارانہ رویہ تھا جو وہ شروع دن سے ہی پاکستان کے خلاف استعمال کر رہے تھے۔ کانگریس کی ناانصافیوں کے بارے میں سابق وزیرِ اعظم پاکستان چوہدری محمد علی لکھتے ہیں:

''تعاون میں دونوں ہی ملکوں کا فائدہ تھا لیکن کانگریس کی پاکستان دشمنی نے اس کی بنیاد اکھاڑ دی تھی۔ پنجاب میں قتلِ عام، نقد بقایا جات اور فوجی ساز وسامان کے جھگڑے، کشمیر اور نہری پانی کے تنازعات اور دوسرے سب قضیے ایک جارحانہ ذہنیت کی پیداوار تھے کہ اگر اس کا بس چلتا تو وہ پاکستان کا پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دیتی۔ کانگریس کے لیڈر کچھ تو اس بات پر غصہ کے مارے اندھے ہو رہے تھے کہ قیامِ پاکستان سے ان کا سارے ہند پر بلا شرکتِ غیرے حکمرانی کا خواب فی الحال شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا لیکن ان کی سوچ بچار کا اصلی محور یہ تھا کہ ہندوستان کے برعکس پاکستان اقتصادی اعتبار سے دیر تک زندہ رہنے کے قابل نہیں لہٰذا ہندوستان اپنے آپ کو نقصان پہنچائے بغیر معاندانہ پالیسی سے پاکستان کے انہدام کو تیز تر کر سکتا ہے۔''(۳)

سیاسی حوالے سے دیکھا جائے تو بھی یہ دور عجیب افراتفری کا شکار نظر آتا ہے، ملک کے پہلے وزیرِ اعظم کا قتل سیاسی حوالے سے اس ملک کے لیے ایک دھچکا ثابت ہوا۔ اس کے علاوہ مارشل لا کی صورت میں آمریت نے جمہوری اداروں کی تباہی

میں بنیادی کردار ادا کیا جس کے نتیجے میں سماجی سطح پر ایسے رویے اور طرزِ عمل پروان چڑھے جنھوں نے پاکستانی سماج کی روح تک کو متاثر کیا، اور بہت سی منفی سرگرمیاں اور منفی رویے سماج میں پروان چڑھنے لگے۔

ہجرت کے فوری بعد مہاجرین کی آبادکاری کے مسائل کے ساتھ ساتھ اک بڑا مسئلہ ہندوؤں اور سکھوں کی متروکہ املاک کو مستحق مہاجرین کو الاٹ کرنا تھا لیکن اس عمل میں بھی جس طرح بدعنوانی کی گئی اس نے شروع ہی سے ملک میں ناانصافی کے وہ بیج بوئے جو آج تناور درخت بن چکے ہیں۔ جعلی الاٹمنٹ کا جو بازار اس وقت گرم کیا گیا اس نے بہت سے مستحقین جو ہندوستان میں اپنے اثاثہ جات چھوڑ کر آئے تھے ان کو اپنے حق سے محروم کر دیا جب ان کے مقابلے میں جاگیردار اور اعلیٰ عہدوں پر براجمان طبقہ پہلے سے بھی زیادہ خوشحال ہو گیا۔ اس ناانصافی سے محکوم اور غریب طبقہ کے استحصال کی جو روایت چلی اس نے آگے چل کر امراء اور صنعت کار طبقہ کی نظر میں غریب اور محکوم طبقہ کو گھر کی لونڈی کی حیثیت دے دی۔ یوں معاشرے کے پسے ہوئے طبقے کا استحصال ہر دور میں جاری رہا۔

۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاکستان کے باشندوں میں جو اتحاد و اتفاق کا جذبہ ابھرا اور سیاسی سطح پر جو ہم آہنگی پیدا ہوئی وہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ جلد ہی سیاسی سطح پر اقلیت کو اکثریت اور اکثریت کو اقلیت میں بدلنے کی جو روش پروان چڑھی اس نے اس ملک کو دولخت کرنے کی راہ ہموار کی۔ سقوط ڈھاکہ ۱۹۷۱ء پاکستان کی تاریخ کا ایسا المناک واقعہ تھا جس کے زخموں سے خون آج بھی رس رہا ہے۔ مشرقی پاکستان میں پاک فوج کا ہتھیار ڈالنا اور ہزاروں سپاہیوں کا جنگی قیدی بنائے جانے کا المناک واقعہ آج تک لوگوں کے اذہان میں اک زخم رسیدہ صورت حال پیدا کیے ہوئے ہے۔ اس المناک واقعہ نے جہاں وطن عزیز کو دولخت کر دیا وہاں مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوام کے دلوں میں نفرت کی ایک ایسی خلیج پیدا کر دی جس کے ختم ہونے کی حسرت معاشرے کے ہر طبقے کے افراد کے دل میں رہی۔ ادیب چونکہ معاشرے کا ایک حساس فرد ہوتا ہے وہ معاشرے میں ہونے والے واقعات سے عام لوگوں کی نسبت زیادہ اثر قبول کرتا ہے اس لیے اردو ادب کی تقریباً تمام اصناف میں اس واقعہ کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ معاشرے کے دیگر افراد کی طرح اس دور کے ادبا اور شعرا کی بھی یہی حسرت تھی کہ کسی طرح یہ خلیج ختم ہو جائے اور پھر سے محبت و اخوت کی فضا بحال ہو جائے۔ اس ضمن میں فیض کی حسرت ملاحظہ ہو!

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی مداراتوں کے بعد
کب نظر آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد(۴)

خون کے ان دھبوں کے دھلنے کے انتظار میں کئی دہائیاں گزر گئیں مگر ہر گزرتے دن کے ساتھ یہ خلیج وسیع ہوتی چلی گئی۔ جس نے سیاست کے ساتھ ساتھ پاکستانی سماج کو بھی خاصا متاثر کیا۔ اس سیاسی اور سماجی پس منظر میں عبداللہ حسین کے ناول ''نادار لوگ'' کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ''نادار لوگ'' کی کہانی کا تانا بانا اس سیاسی و سماجی پس منظر سے تشکیل دیا گیا ہے۔ ''نادار لوگ'' کی کہانی کا آغاز ریل کے ایک سفر سے ہوتا ہے۔ اس دوران قاری ناول کے ایک کردار سرفراز سے متعارف ہوتا ہے۔ سرفراز، یعقوب اعوان کا بیٹا اور فوج میں میجر کے عہدے پر سرفراز ہے۔ اپنے خیالات اور یادداشت کے بل بوتے پر گزرے واقعات کو یاد کرتا ہے اس کا باپ کم عمری میں ہے اسے بڑے بھائی اعجاز کی سرپرستی میں چھوڑ کر فوت ہو جاتا

ہے جبکہ ماں، سرفراز کی پیدائش کے وقت ہی دنیا سے کوچ کر جاتی ہے۔ اعجاز، سرفراز کا بڑا بھائی تعلیم کے شعبہ سے بطور استاد وابستہ ہے مگر بعد میں مزدوروں کی حمایت میں مزدور یونین کے اراکین سے تعلقات کی وجہ سے اس سے استعفیٰ لے کر ملازمت سے فارغ کر دیا جاتا ہے۔ جس کے بعد اس کی زندگی بے شمار نشیب و فراز سے گزرتی چلی جاتی ہے۔ جاگیرداروں سے مقابلے، کھیتی باڑی، مزدور یونین، سیاسی سرگرمیاں اعجاز کی زندگی کا حصہ بن جاتی ہیں۔ اعجاز کی بیوی سکینہ مہر و وفا کا پیکر ثابت ہوتی ہے۔ جو اعجاز کے مسائل کے حل میں برابر کی شریک اور ہمدرد ہونے کے ساتھ ساتھ سرفراز کے لیے بھی ہمدردانہ اور مشفقانہ جذبات رکھتی ہے۔

سرفراز اپنے بڑے بھائی کی خصوصی توجہ اور شفقت سے آرمی میں کمیشن حاصل کر لیتا ہے اعجاز اس کی مزید تعلیم کا خواہش مند ہوتا ہے مگر سرفراز کی خواہش کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ سرفراز آرمی میں ایک کامیاب افسر ثابت ہوتا ہے لیکن بعد میں سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے ایک کمیشن رپورٹ کو جواز بناتے ہوئے سرفراز کو ملازمت سے سبکدوش کر دیا جاتا ہے۔

اس ناول میں اعجاز کا واسطہ جاگیردار طبقہ کے لوگوں سے بھی پڑتا ہے جن کی نمائندگی ناول میں ملک جہانگیر کا کردار کرتا ہے۔ سماجی تناظر میں دیکھا جائے تو ملک جہانگیر کا تعلق جس سماجی طبقے سے ہے اس طبقہ کا مقصد ہی غریب عوام کا استحصال اور انہیں اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ ملک جہانگیر اس حوالے سے ایک حقیقی استحصال کا روپ دھارے سامنے آتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مزدور یونین، بھٹہ خشت کے لوگوں اور دیگر سماجی طبقات کی عکاسی سے نادار لوگ کی کہانی کو مزین کیا گیا ہے۔ ناول کے دوسرے باب میں ناول نگار ۱۸۹۷ء کے حالات و واقعات میں چلے جاتے ہیں جہاں سکھ گھرانوں اور اعجاز، سرفراز کے آباواجداد سے تعارف ہوتا ہے۔ اس باب میں فسادات کے دوران ان سکھ گھرانوں کی ہمدردیوں اور وفاداریوں کا بھی تذکرہ ملتا ہے اس کے علاوہ فسادات کے واقعات بھی سامنے آتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ ناول معاشرے کے اس طبقے کی عکاسی کرتا ہے جو غریب ہیں اور امرا اور جاگیرداروں کے رحم و کرم پر پڑے ہیں۔ ظلم کی چکی میں پستے چلے آرہے ہیں مگر انہیں اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ انھی لوگوں کو عبداللہ حسین نے نادار لوگ کہا ہے۔ اپنے ایک انٹرویو میں عبداللہ حسین کہتے ہیں:

> ''دراصل میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ ادیب کو ہر اس پہلو کی نشاندہی کر دینی چاہیے اور ہر اس ادارے کو تنقید کا نشانہ بنانا چاہیے جو کرپٹ ہو جو لکھنے والا کرپشن اور ناانصافی کے خلاف برسرِ پیکار نہ ہو، اسے ادیب نہیں کہنا چاہیے اگر پاکستان کے حالات کا جائزہ لیں تو کوئی شعبہ یا ادارہ ایسا نہیں ہے جہاں کرپشن نہ ہو اس افراتفری کی وجہ سے سب سے زیادہ غریب اور مفلوک الحال لوگ متاثر ہو رہے ہیں۔ اسی لیے میں نے اس ناول کا نام ''نادار لوگ'' رکھا ہے۔'' (۵)

یوں ان بے شمار ''نادار لوگوں'' کی زندگیوں کے نشیب و فراز سے اس ناول کی کہانی تشکیل دی گئی ہے۔ تقسیم کے بعد کے سماجی حالات و واقعات کو مدنظر رکھ کر اس ناول کا جائزہ لیا جائے تو سماج کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے اطوار اور طرزِ عمل کا مشاہدہ ناول میں نہ ملتا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ سیاسی سطح پر ہونے والی ہلچل، آمریت اور دیگر امور کی بھی کامیاب عکاسی کی گئی ہے۔

تقسیم کے بعد سیاسی اتار چڑھاو کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ پاکستان کی سیاسی صورت حال ابتدا سے

ہی دگرگوں رہی۔ ملک کے پہلے وزیرِاعظم کے قتل سے پیدا ہونے والی سیاسی ہل چل تا حال سیاسی حوالے سے ملک کو مستحکم نہیں کر سکی۔ بار بار منتخب حکومتوں کا تختہ الٹ کر مارشل لا کے نام پر آمریت کا عنانِ اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لینا اور پھر حکومت چلانے میں ناکامی پر نااہل لوگوں کو حکومت کی باگ دوڑ تھما کر خود ایک طرف ہو جانا ایسے اقدامات تھے جنھوں نے سیاسی حوالے سے اس ملک کو مستحکم نہیں ہونے دیا۔

سیاسی طور پر پسماندگی کی ایک اور بڑی وجہ سیاسی جوڑ توڑ ہے۔ جب کسی سیاسی جماعت کی اکثریت کو جوڑ توڑ کے ذریعے اقلیت میں تبدیل کر کے اسے اقتدار سے دور کر دیا جائے تو اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ عوام کی خواہشات اور عوام کے انتخاب کو رد کر دیا گیا ہے۔ پاکستان میں سیاسی جوڑ توڑ کے ثمرات پر نظر ڈالی جائے تو سیاستدانوں کے اس رویہ نے ملک کو ہر محاذ پر خاصا نقصان پہنچایا ہے۔ حتیٰ کہ سقوطِ ڈھاکہ کے المیہ کے پیچھے بھی دیگر بہت سے عناصر کے ساتھ ساتھ کافی حد تک یہی سیاسی جوڑ توڑ کا روّیہ کارفرما نظر آتا ہے۔ اربابِ اقتدار اپنی اور اپنے حریفوں کی کرسیوں کو مضبوط کرنے کے لیے ضروری ملکی امور بھی پس پشت ڈال دیتے تھے۔ قدرت اللہ شہاب ملک کے آخری گورنر جنرل اور پہلے صدر کے سیاسی جوڑ توڑ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اسکندر مرزا جوڑ توڑ کے بادشاہ تھے۔ گورنر جنرل یا صدر کے طور پر آئینی بندشوں اور پابندیوں میں مقید ہو کر رہنا ان کے لیے ناممکن تھا۔ جب ان کے دوست ڈاکٹر خان صاحب مغربی پاکستان کے وزیرِاعلیٰ نامزد ہوئے تو انھیں کسی سیاسی پارٹی کی حمایت حاصل نہ تھی ان کی دستگیری کے لیے اسکندر مرزا صاحب نے ری پبلکن پارٹی کی داغ بیل ڈالی۔ اس پارٹی کی تشکیل گورنمنٹ ہاؤس میں براہ راست ان کی سربراہی میں ہوئی۔ جس وقت یہ پارٹی بن رہی تھی۔ ان دنوں اسکندر مرزا اس کام میں اس قدر منہمک تھے کہ انہیں فائلیں دیکھنے کا بھی وقت نہ ملتا تھا۔''(۶)

اسی سیاسی جوڑ توڑ نے ملک میں حقیقی جمہوریت کو پنپنے نہ دیا اور سیاسی طور پر ملک کی جڑیں کھوکھلی ہوتی چلی گئیں۔ ''نادار لوگ'' میں عبداللہ حسین نے تقسیم کے بعد کے سیاسی حالات کو منکشف کرنے کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے۔ ''نادار لوگ'' میں جہانگیر کے کردار کو سیاسی رہنما کے طور پر لیا گیا ہے جو پہلے جاگیردار، پھر صنعت کار بن کر مظلوموں کا استحصال کرتا ہے بعد میں سیاست کی طرف چل نکلتا ہے۔ جہانگیر کے کردار سے قبل ناول میں عبداللہ حسین نے چند ذیلی کرداروں کے ذریعے بھی سیاسی ابتری کو نمایاں کیا ہے۔ سیاسی پس منظر کو سامنے رکھ کر نادار لوگ کی کہانی کو دیکھا جائے تو عبداللہ حسین نے سیاست کے ذریعے غریبوں اور مظلوموں کے استحصال کے علاوہ سیاسی چالبازیوں کو بھی بڑی مہارت سے نمایاں کیا ہے۔

''اداس نسلیں'' کی طرح نادار لوگ میں بھی عبداللہ حسین نے مختلف کرداروں کے ذریعے ناول کی کہانی کو آگے بڑھایا ہے۔ زندگی کے تمام طبقات کی نمائندگی اس ناول کے کرداروں کے ذریعے کی گئی ہے۔ اس ناول میں جو کردار سامنے آتے ہیں ان میں یعقوب اعوان، چاچا احمد، اعجاز، سرفراز، عباس، بشیر آرائیں، ملک جہانگیر، اور دیگر مردانہ کرداروں کے ساتھ ساتھ سکینہ، نسرین، کنیز، نسیمہ اور ماسی جیسے نسوانی کردار شامل ہیں۔ عبداللہ حسین نے ان کرداروں کے ذریعے نوآبادیاتی اور پس نوآبادیاتی سماج کی تصویر کشی اور بہت سے اسرار سے پردہ اٹھایا ہے۔ اعجاز کا تعلق شعبہ تعلیم سے ہوتا ہے لیکن ملازمت کے چند سال بعد ہی

اسے یونین کے لوگوں سے روابط رکھنے کی وجہ سے اپنی ملازمت سے مستعفیٰ ہونا پڑتا ہے اور وہ استعفیٰ بھی وہ اپنی مرضی سے نہیں دیتا بلکہ ہیڈ ماسٹر اسے ڈرا کر استعفیٰ لیتا ہے کہ اگر ملازمت نہ چھوڑی تو بات گرفتاری تک بھی پہنچ سکتی ہے۔اس واقعہ سے عبداللہ حسین نے پس نو آبادیاتی عہد کی اس بدعنوانی کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے جو اس وقت تمام سرکاری محکموں میں رواج پا چکی ہے۔ ہر افسر اور اس کے کارندے ملکی خزانے اور اختیارات کو غلط انداز میں استعمال کرنے لگے ہیں اور اگر ان کے اندر سے ہی کسی کا ضمیر جاگتا ہے اور وہ حق کی آواز بلند کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ہمیشہ کے لیے اس آواز کو دبا دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ استحصال کاروں کے نزدیک سب سے عزیز اپنے مقاصد ہیں اپنے مقاصد سے آگے انہیں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ان مقاصد کے حصول کے لیے وہ تمام اوچھے ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں جن سے ان کے خلاف ہونے والی بغاوت کو دبا دیا جا سکے۔لیکن اس ناول میں اعجاز کے کردار کے ذریعے عبداللہ حسین یہ دکھانے میں کامیاب ہوئے ہیں استحصال اور محرومی کے خلاف ہونے والی بغاوت کو وقتی طور پر ٹھنڈا تو کیا جا سکتا ہے لیکن دبایا نہیں جا سکتا۔اعجاز کی صورت میں یہ بغاوت کسی نہ کسی صورت میں ضرور موجود رہتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس ناول میں اعجاز کا کردار متنوع کیفیات کا حامل نظر آتا ہے۔

اعجاز کی سکول سے برخواستگی نے اس کا جس طرح استحصال کیا، وہ یہ بات جان گیا کہ اس معاشرے میں باعزت طور پر رہنے کے دو ہی راستے ہیں یا تو صاحب اقتدار لوگوں کی ہر بات میں ہاں میں ہاں ملائی جائے یا پھر ان کا مقابلہ کیا جائے۔اس نے دوسرے رستے کا انتخاب کیا مگر وہ مقابلے کے تمام داؤ پیچ جانتا تھا۔وہ جانتا تھا کہ اس ملک میں سیاستدانوں اور استحصال کاروں کا مقابلہ ان کے میدان میں ہی کیا جا سکتا ہے۔اس لیے وہ اس طرف بڑھا مگر اس کی سیاسی پارٹی بھی روایتی سیاست کی حامل نظر آئی۔جو انتخابات سے قبل کیے گئے تمام وعدے بھول جانے پر ذرا بھی شرمندگی محسوس نہیں کرتی۔

مارشل لا نے جمہوریت کی بساط لپیٹ کر سیاستدانوں کو مفلوج تو کیا ہی تھا معاشرے کے دیگر طبقات کے لوگ بھی اس کی زد میں آنے سے نہ بچ سکے۔حتیٰ کہ اپنے حقوق کی خاطر اٹھنے والی آوازیں میں بھی سنسر ہونے لگیں اور ان آوازوں کے ساتھ جو آواز بھی ملتی اسے دبانے کی بھی ہر طرح کی کوشش کی جاتی۔اعجاز کی ملازمت سے برخواستگی بھی اسی مارشل لا کی وجہ سے عمل میں آئی۔اعجاز ہیڈ ماسٹر کی طرف سے وارننگ ملنے پر یونین کے ساتھ اپنی سرگرمیوں کو معطل کر دیتا ہے پھر بھی ایک برادری کے آدمی اور دوست سے تعلق ہونے کی وجہ سے اسے انتقام کا نشانہ بنایا گیا اور ہیڈ ماسٹر اس کا جواز فراہم کرتے ہوئے کہتا ہے:

> ''آپ کس دنیا میں رہتے ہیں مارشل لا لگ چکا ہے، کچھ پتا ہے آپ کو؟ پہلے دیواروں کے کان ہوتے تھے، اب آنکھیں بھی لگ گئی ہیں۔منٹ منٹ کی خبر اوپر پہنچ رہی ہے۔کیوں ہم سب کی روزی گنوانے کے چکر میں ہو۔'' (۷)

بنیادی انسانی حقوق کے حوالے سے دیکھا جائے تو ہر فرد کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ اس کو کسی بھی امر کی سزا دینے سے قبل اپنی صفائی کا موقع دیا جائے۔سرکاری ملازم کے لیے تو یہ حق اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے کسی بھی سرکاری ملازم کے خلاف کسی بھی کارروائی سے قبل اسے نوٹس بھیج کر اور بعد میں ذاتی شنوائی کے ذریعے اسے اپنی صفائی دینے کا مکمل موقع فراہم کیا جاتا ہے پھر اس کے خلاف اگر جرم ثابت ہو جائے تو جرم کی نوعیت کی مناسبت سے کارروائی کی جاتی ہے لیکن نادار لوگ میں ہیڈ ماسٹر چیمہ صاحب نے اعجاز سے جس طرح ملازمت سے استعفیٰ لیا وہ بنیادی حقوق کے منافی امر ہے۔اس امر کے پیچھے وہ سیاسی قوتیں اور مارشل لا کے عناصر کارفرما ہیں۔جن کا مقصد دھونس، دھاندلی اور رعب و دبدبہ کے ذریعے اپنے سیاسی مخالفین کو کچلنا ہوتا ہے۔ہیڈ

ماسٹر، اعجاز کو اس کا یہ جرم بتاتا ہے کہ اس کے یونین کے کسی شخص کے ساتھ تعلقات ہیں اعجاز کا جواب تھا کہ اگر ایسی بات ہے تو وہ اس شخص سے ملنا بھی چھوڑ دے گا لیکن ہیڈ ماسٹر تو کچھ اور ہی کرنے کو جا رہا تھا۔

''ایسے کام نہیں چلے گا'' ہیڈ ماسٹر نے دہرا کر کہا اور ایک ٹائپ شدہ کاغذ میز کی دراز سے نکال کر اعجاز کے آگے بڑھا دیا۔

''اس پر دستخط کر دو''

''یہ کیا ہے؟'' اعجاز کی رکتی ہوئی آواز نکلی۔

''تمہارا استعفیٰ ہے'' ہیڈ ماسٹر نے اکتائے ہوئے لہجے میں ہاتھ ہلا کر کہا ''پڑھ لو''(۸)

ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد اعجاز اپنی زمین کی دیکھ بھال اور کاشت کاری کی طرف توجہ دیتا ہے اس کے ساتھ ساتھ غریبوں اور محکوموں کے استحصال کے خلاف وہ مختلف یونینز سے بھی اپنے تعلقات بڑھاتا چلا جاتا ہے اور بہت جلد معاشرے میں ایک معروف نام کے طور پر ابھرتا ہے۔ اعجاز کا معاشرے میں ایک معروف شخص کے طور پر ابھرنا استحصالی قوتوں کو کسی صورت برداشت نہیں ہوتا، وہ پہلے اس کے ذریعے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جب اس میں کامیابی نہیں ہوتی تو ایک بار پھر اسے انتقام کا نشانہ بنا کر اس کے کھیتوں میں ہل چلا دیئے جاتے ہیں مگر اس نقصان کے بعد بھی وہ ہمت نہیں ہارتا اور کٹی ہوئی گنّے کی فصل سے گڑ بنا کر اپنا نقصان پورا کرتا ہے۔ یہاں پر اعجاز کا کردار ایک منجھے ہوئے انسان کا کردار لگتا ہے جو جہانگیر جیسے صنعت کاروں پر براہ راست ہاتھ ڈالنے کی بجائے معاشی طور پر خود کو مستحکم کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ صنعت کاروں سے بدلہ لینے کے لیے ان جیسا معاشی استحکام بہت ضروری ہے۔

اعجاز کے کردار کا ایک اور رخ جو ''نادار لوگ'' میں سامنے آتا ہے وہ ایک ایسے سیاست دان کا کردار ہے جو روایتی سیاست سے مایوس ہو چکا ہے اور لوگوں کے استحصال کے خلاف سیاسی پلیٹ فارم سے آواز بلند کرنے کا خواہاں ہے۔ وہ جس سیاسی پارٹی میں شامل ہوتا ہے اس کے منشور میں لوگوں اور خاص طور پر غریب عوام کو استحصال اور محکومی سے نجات دلانا شامل ہے۔ اس کے لیے وہ غریب اور محکوم طبقہ میں اثر و رسوخ رکھنے والے درمیانی طبقے کے لوگوں کو سامنے لاتی ہے تاکہ محکوموں کی ہمدردیاں حاصل کر کے اقتدار حاصل کیا جا سکے لیکن اقتدار ملنے کے بعد یہ پارٹی بھی روایتی پارٹی ثابت ہوتی ہے۔ اقتدار سے پہلے ان کے نعروں کی بازگشت اقتدار ملنے کے بعد کہیں سنائی نہیں دیتی۔ اقتدار حاصل کرنے سے قبل اعجاز جیسے لوگوں کی پارٹی میں شمولیت نے سیاست میں خاصی ہلچل پیدا کی۔ اعجاز ایک ایسے سیاست دان کے طور پر سامنے آیا جس نے عوام کی حقیقی فلاح و بہبود کا نعرہ لگایا۔ اس نے ایک سیاسی اجتماع میں جو قراردادیں منظور کروائیں ملاحظہ ہوں:

''آج سے...... آج سے ہمارا مطالبہ ہے کہ کوئی حکومت اور کوئی لیڈر ''عوام'' کا لفظ استعمال نہ کرے، یہ دھوکا دہی کا لفظ ہے۔''(۹)

قیامِ پاکستان سے لے کر تا حال ملکی سیاست میں عوام کو جس طرح رگیدا گیا اس کی مثال نہیں ملتی ہر حکومت اور ہر نمائندے نے خود کو عوامی نمائندہ کے طور پر پیش کیا اور ووٹ لینے کے بعد عوام سے لاتعلق ہو گئے۔ مندرجہ بالا اقتباس عوام کے لفظ کے انہی معنوں کی عکاسی کرتا ہے کہ اقتدار کی مسندوں پر براجمان ہونے کے لیے عوام کی فلاح کے نعرے لگائے جاتے اور اقتدار ملتے ہی جس ''عوام'' کی فلاح کی کوششیں شروع ہو جاتی ہیں وہ اس ملک کے غریب اور محکوم طبقہ سے الگ ہی کوئی طبقہ ہوتا تھا۔

اعجاز کا کردار ایک ایسے مصلح کا کردار بن کر سامنے آتا ہے جو غریب اور پسے ہوئے طبقے کی حقیقی فلاح و بہبود کا حامل ہے۔ وہ غریبوں اور محکوموں کو وعدوں اور سبز باغوں پر ٹرخانے کا حامی نہیں بلکہ وہ قول و فعل کے تضاد کو ختم کرنے، عمل اور خود اعتمادی کا حامی ہے۔ اس کی زندگی عمل سے عبارت ہے وہ کہتا ہے:

> ''پچیس سال سے ہم حکومتوں کی بات سنتے آئے ہیں کہ یہ ہو جائے گا وہ ہو جائے گا ایسا کر دیں گے، ویسا کر دیں گے، یہ گا، گے، گی سنتے سنتے ہمارے کان پک گئے ہیں............اس لیے ہمارا دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ آج کے بعد کوئی حکومت اور کوئی لیڈر گا، گے اور گی کے لفظ استعمال نہ کرے۔ یہ بھی دھوکا دہی کے الفاظ ہیں'' آج کے بعد'' اعجاز نے کہا'' حکومت کے ہر بیان میں'' ہے'' کا لفظ برتا جائے۔ یہ سچا لفظ ہے۔''(۱۰)

''نادار لوگ'' میں استحصالی طبقہ کی ریشہ دوانیوں کی عکاسی جہانگیر کے طرزِ عمل سے کی گئی ہے۔ ''نادار لوگ'' کے کرداروں کا اگر باہمی تقابل کیا جائے تو سب سے متحرک اور جاندار کردار جہانگیر کا کردار نظر آتا ہے۔ سرفراز اور اعجاز کا تعلق محکوم طبقے سے تھا لیکن جہانگیر ایک ایسا کردار ہے جو مابعد نوآبادیاتی عہد میں بھی نوآبادیاتی طرز کی استحصالی قوتوں کے نمائندے کے طور پر سامنے آتا ہے۔ جعلی الاٹمنٹ کی صورت میں ملنے والی جاگیر کے بل بوتے پر جہانگیر نے غریب اور پسماندہ طبقے کے استحصال کی جو روایت ڈالی اس سے یہ ظاہر ہونے لگا کہ نوآبادیاتی عہد میں روا رکھے جانے والے استحصالی رویے سے مابعد نوآبادیاتی عہد میں بھی چھٹکارا نہ مل سکا بلکہ اقتدار کے ایوانوں میں صرف چہروں کی ہی تبدیلی آئی۔

جہانگیر کا کردار صحیح معنوں میں استحصال کار کا رویہ اپناتا ہے۔ جاگیرداری سے صنعت کاری اور پھر اس سے آگے بڑھتے ہوئے اقتدار کے ایوانوں تک رسائی اس کردار کے استحصالی رویے کو مزید مضبوط اور توانا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ جہانگیر کو جاگیر وراثت میں ملی تھی جس کو مزید ترقی دیتے ہوئے اس نے صنعت کاری کی طرف توجہ دی اور شوگر مل لگائی۔ شوگر مل کے لیے خام مال گنا کے حصول کے لیے بھی اس نے استحصالی رویہ اپنایا۔ اعجاز کی شاندار گنے کی فصل کو ذاتی عناد اور بغض کی بنا پر وہ راتوں رات ٹریکٹر چلوا کر تباہ کروا دیتا ہے صرف اس وجہ سے اعجاز گڑ بنا کر منافع کماتا ہے اور جہانگیر کی مل کو خام مال نہیں دیتا دوسری طرف مل کے اندر مزدوروں کے ساتھ وہ استحصالی رویہ اپناتے ہوئے ان کے حقوق غصب کرتا چلا جاتا ہے اور جب مزدور یونین ہڑتال پر آمادہ ہوتی ہے تو جہانگیر اعجاز کے اثر و رسوخ کی وجہ سے اسے میدان میں اتارتا ہے۔ اعجاز مزدوروں اور جہانگیر کے درمیان معاہدہ کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے مگر جہانگیر بعد میں بڑی عیاری کے ساتھ مزدوروں سے کیے گئے وعدوں سے مکر جاتا ہے اور استحصالی رویہ اپنائے رکھتا ہے۔ دوبارہ اعجاز کے تیار نہ ہونے پر وہ انتقام لینے کے لیے اس کی فصل کو برباد کروا دیتا ہے۔

جہانگیر کا کردار ایک ایسے شخص کا کردار ہے جس کی نظر ہر پل حالات پر ہے وہ حالات کے مطابق اپنی پوزیشن مستحکم کرنے میں لگا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایوب خان کے دورِ حکومت میں جب صنعتی انقلاب کا ڈول ڈالا گیا تو جہانگیر جیسے لوگوں نے اپنی جاگیر بیچ کر صنعتی شعبے میں سرمایہ کاری کی جہانگیر کا بیان ملاحظہ ہو:

> ''اب ہماری نجات انڈسٹری میں ہے، اعجاز ایوب خان کا ذہن انڈسٹری کی طرف ہے کیا خبر کل کو یہ زمینداروں کے ساتھ کیا کرے...... نہ جانے کس وقت یہ مارشل لا کے زور پہ زمینداروں کا پتا ہی صاف کر دے۔ اسی لیے بھائی ابھی سے دور اندیشی کرنی پڑے گی۔

جدھر کی ہوا چلے ادھر کو ہی منہ کر لو، فاصلہ جلد ہی طے ہوتا ہے''(۱۱)

ناول میں جہانگیر کے کردار کے ذریعے عبداللہ حسین نے اس سیاسی چالبازی کو نمایاں کیا ہے کہ سیاست دان کا مطمع نظر صرف اور صرف اقتدار کا حصول ہے اس مقصد کے لیے وہ کوئی بھی ذریعہ اختیار کر سکتا ہے۔ اقتدار کے حصول کے ساتھ ساتھ صاحب اقتدار بننے کے بعد ملکی پیسہ کو ذاتی ملکیت بنانا اور پھر اس پیسے کے ذریعے اگلی دفعہ پھر اقتدار حاصل کرنا سیاست دانوں کا وطیرہ ہے یوں پس نو آبادیاتی عہد میں پاکستانی سیاست اقتدار اور پیسے تک محدود ہو کر رہ گئی۔ عوامی فلاح و بہبود سے روگردانی برتی جانے لگی۔ ناول میں ایک مقام پر جہانگیر، اعجاز کو سیاست کے حوالے سے جو مشورے دیتا ہے ان سے اس دور کی سیاسی چالبازیوں سے بخوبی آگاہی ہوتی ہے۔

> ''بھولے بادشاہ!'' جہانگیر کہنیاں میز پر رکھ کر آگے جھکا اور اعجاز کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔'' آج میں تجھے سیاست کے ایک دو سبق دیتا ہوں ....سیاست کے دو سبق ذہن نشین کرو۔ پہلا سبق مشہور کہاوت کے مطابق یہ کہ اپنے سارے انڈے ایک ٹوکری میں مت ڈالو۔ مطلب یہ کچھ بھائی برادری سرکار کے ساتھ رکھو، کچھ اپوزیشن کے ساتھ، تاکہ جس کسی کا راج ہو، حکومت اپنے ہی ہاتھ میں رہے، دوسری بات'' جہانگیر ہاتھ پھیلا کر انگوٹھا پہلی دو انگلیوں پر ملنے لگا'' یہ ہے؟'' وہ بولا پھر ہاتھ پہلو پہ لے جا کر کرتے کی جیب کو تھپتھپایا ''اور یہ''۔''(۱۲)

اسی طرح آگے اک اور مقام پر جہانگیر سیاست کے مستقبل پر بات کرتے ہوئے کہتا ہے:

> ''اب جس کی جیب میں پیسہ، اس کے ہاتھ میں باگ جیسے جیسے وقت گزرے گا، سیاست ان کے ہاتھ میں آئے گی جن کی جیب مضبوط ہو گی پھر یہ تو آپ کو پتا ہی ہے کہ پیسے سے پیسہ بنتا ہے۔''(۱۳)

ان دو اور ان جیسے دیگر بیانات سے پس نو آبادیاتی عہد میں سیاسی صورت حال اور سیاست دانوں کے روّیوں اور مقاصد کو سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔ اس دور میں سیاست کا مقصد صرف اقتدار اور پیسہ ہی رہ گیا۔ جہانگیر کا یہ کہنا ہے کہ سیاست ان کے ہاتھ میں آئے گی جن کی جیب مضبوط ہو گی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ غریب عوام کا اسمبلیوں تک پہنچنا ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور حقیقت بھی قابل توجہ ہے سیاست دانوں کو اقتدار کی کرسیوں تک پہنچانے میں خاصا کردار غریب اور مفلوک الحال لوگوں کا ہی رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سیاست دان مختلف حیلوں بہانوں سے غریب اور مفلوک الحال لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی تگ و دو میں رہتا ہے۔ نادار لوگ میں جہانگیر کا اعجاز کے ساتھ مراسم بڑھانا اسی وجہ سے تھا کہ اعجاز بھٹہ مزدوروں اور مل مزدوروں میں اچھے خاصے اثر و رسوخ کا مالک تھا۔ اعجاز کی بات ان مظلوم طبقہ کے لوگوں میں نہ صرف توجہ سے سنی جاتی تھی بلکہ وہ اس کی بات کو خاص اہمیت بھی دیتے تھے۔

جہانگیر کی صورت میں ان سیاست دانوں اور استحصال کاروں کی عکاسی کی گئی ہے جن کو صرف اور صرف اپنی ذات کو فائدہ پہنچانے سے غرض ہوتی ہے اس مقصد کے لیے رستے میں جو بھی رکاوٹ آتی ہے وہ اسے ہٹانے کے درپہ رہتے ہیں، رکاوٹیں دور کرنے کے لیے اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ ان کی کارستانیوں سے معاشرے کے کتنے لوگ متاثر ہوں

گے یا کتنے گھروں کے چراغ بجھ جائیں گے۔ اعجاز اور جہانگیر ایک ہی دور اور ایک ہی معاشرے کے افراد ہیں لیکن استحصالی رویے نے جہانگیر کے دل سے سچ اور جھوٹ کی پہچان بھی ختم کر دی ہے صرف یہی نہیں بلکہ وہ ایسے سچ کے خلاف بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہے جس سے اس کے مفادات کو زک پہنچتی ہو۔ اعجاز اور سرفراز کو جن مصائب اور مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے اس کی بڑی وجہ بھی یہی استحصالی طبقہ ہے جو اپنے مفادات کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو دبا دینا چاہتا ہے۔ محمد عاصم بٹ لکھتے ہیں:

> ''دونوں ہی بھائیوں کو سچ کا ساتھ دینے اور صاحبانِ اقتدار کی بے حسی کو نشانہ تنقید بنانے کی سخت سزا دی جاتی ہے۔ یہ دو کردار چونکہ معاشرے کے ان افراد کی نمائندگی کرتے ہیں جو سچ کی حفاظت کے لیے اپنی جان اور مال کی پرواہ نہیں کرتے سو معاشرے میں جھوٹ پھیلانے اور اس کی حفاظت کرنے والی قوتیں ان کی زبان بند کی ہر ممکن کوشش کرتی ہیں اور ساری مشینری ان کے خلاف متحرک ہو جاتی ہے۔'' (۱۴)

ان استحصالی قوتوں کی کارستانیوں کی وجہ سے سماج میں آج بھی نو آبادیاتی طرز کا استحصالی نظام روز بروز پروان چڑھتا جا رہا ہے۔ سماج دشمن یہ استحصالی طبقہ اپنے مفادات کے حصول کے لیے ہر حد پار کرنے کو تیار رہتا ہے۔ ''نادار لوگ'' میں جہانگیر کے کردار کے ذریعے عبداللہ حسین نے اسی استحصالی طبقے کی کارستانیوں کو بے نقاب کیا ہے۔

''نادار لوگ'' میں عبداللہ حسین نے گھریلو زندگی کے بعض پہلوؤں سے بھی نقاب سرکایا ہے۔ سکینہ جو اعجاز کی بیوی ہے انتہائی مشفق، غم گسار اور ہمدرد عورت کے روپ میں سامنے آتی ہے وہ ایک روایتی خاندانی عورت ہے جو اپنے خاندان کے عزت وقار کو قائم رکھنے کے لیے کوشاں رہتی ہے۔ سکینہ ایک ایسی عورت کے روپ میں سامنے آتی ہے جسے اس حقیقت کا ادراک ہے کہ معاشرے میں عزت سے رہنے کے لیے معاشی استحکام ضروری ہے۔ اسی لیے وہ اعجاز کو بار بار کاشت کاری پر توجہ دینے کا کہتی رہتی ہے اور جب اعجاز اپنی سماجی سرگرمیوں کی وجہ سے کاشت کاری کے لیے وقت نہیں نکال سکتا تو وہ زمین کو ٹھیکے پر دینے کا کہتی ہے یہاں سکینہ کا کردار ایسی عورت کا کردار ہے جسے خاندانی جاہ و جلال اور عزت و آبرو سے انس ہے۔ وہ کسی صورت برداشت نہیں کر سکتی کہ ان کی زمین میں فصلوں کی بجائے جھاڑیاں اگیں یا وہ اناج کے لیے دوسروں کے محتاج ہوں۔

سکینہ کے کردار کا ایک اور روپ جو سامنے آتا ہے وہ ایک ایسی روایتی خاندانی عورت ہے جو اپنے استحصال کو اپنی خاندانی عزت و ناموس میں نقب زنی کے مترادف سمجھتی ہے اور استحصال کے خلاف اٹھنے اور بدلہ لینے کے جذبے سے سرشار ہے۔ جہانگیر کی طرف سے فصل کی تباہی کے بعد وہ عام عورتوں کی طرح صرف رونے دھونے پر اکتفا ہی نہیں کرتی بلکہ بدلہ لینے پر اتر آتی ہے۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ فصل کی تباہی سے پہلے سکینہ کے خیالات استحصالی قوتوں کے خلاف نہیں بلکہ وہ جہانگیر کے ساتھ راہ و رسم بڑھانے کے حق میں ہوتی ہے لیکن فصل کی تباہی کے بعد اپنے باپ سے ہونے والی گفتگو دیکھئے:

> ''ابا اس کا بدلہ لینا ہے'' بی بی نے کہا۔
> بی بی کے اندر حیرت ناک تبدیلی آ گئی تھی اب وہ اپنا بھی بھلا دوسروں کا بھی بھلا، والی بات بھول چکی تھی۔'' (۱۵)

اور بدلہ لینے کا انداز ملاحظہ ہو:

> ''سات ایکڑ تو بچ گیا ہے'' بی بی نے کہا'' ہم گڑ بنا لیں گے مگر اس کی مل بند کرا دیں

گے۔''(۱۶)

سکینہ کے یہ جذبات بھی استحصالی نظام کے شکنجے میں جکڑے ہی رہ جاتے ہیں وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ سکینہ کے علاوہ کنیز کے کردار کے ذریعے عبداللہ حسین نے سماجی بے راہ روی اور مطلب پرستی کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ کنیز ایک ایسی عورت ہے جس نے کسی کے ساتھ باقاعدہ نکاح نہیں کیا بلکہ ایک شخص بشیر احمد کے ساتھ اس کے جسمانی تعلقات تھے اور بظاہر وہ دونوں کے دوسرے کے لیے خاوند، بیوی کی طرح ہی قریب تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بشیر کو ملکوں کے آدمی تشدد کا نشانہ بناتے ہیں تو کنیز اس طرح واویلا کرتی ہے گویا اس کے خاوند کو مارا جا رہا ہو۔ اعجاز جب بھٹے کے مزدوروں سے ملتا ہے اور ان کے مسائل کے حل کے لیے کوشاں ہوتا ہے تو کنیز بھی اعجاز کے قریب آتی چلی جاتی ہے اور دونوں کے درمیان تعلقات بہت مضبوط ہو جاتے ہیں۔

عبداللہ حسین نے نادار لوگ میں انسانی زندگی کے خفیہ گوشوں سے نقاب سرکایا ہے۔ مابعد نو آبادیاتی عہد کے سیاسی چلن سے لے کر سماجی رویوں تک زندگی کے مختلف شعبوں کے اسرار و رموز سے قاری کو روشناس کروایا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی حاصل کرنے کے بعد جب دونوں ممالک میں قافلوں کی آمد کا سلسلہ چلا تو دونوں طرف بہت سے لوگ ایسے تھے جو اپنے وطن میں زمینوں اور جاگیرداروں کے مالک تھے۔ ہجرت کے سبب وہ ان زمینوں سے بے دخل ہو کر نئے ملک میں چلے آئے۔ قوانین کی رو سے جن لوگوں نے ہندوستان میں زمینیں اور جاگیریں چھوڑیں تھیں پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں کی متروکہ املاک اور جاگیروں سے ان کو حصہ ملنا تھا لیکن یہاں پر پہلے سے موجود جاگیرداروں نے ان مہاجرین کا بھی خوب استحصال کیا۔ مصیبت کے مارے ان مہاجرین کے حصوں میں آنے والی زمینوں کو یہاں پر موجود جاگیردار اور صنعت کار طبقے نے دھونس دھاندلی اور ہٹ دھرمی کے ذریعے اپنے نام کروالیا۔ جس کی وجہ سے ابتدا سے ہی اس ملک میں غریب اور مفلوک الحال کے استحصال کی بنیاد رکھ دی گئی۔ نادار لوگ میں عبداللہ حسین جعلی الاٹمنٹ کے اس قبیح دھندے کو نمایاں کرتے ہیں۔ یہاں بھی سیاسی اور انتظامی عہدوں پر براجمان افراد نے ملکی دولت کو حق داروں تک پہنچانے کی بجائے خیانت کا بازار گرم کیا۔ دوسری طرف دیکھا جائے تو لٹے پٹے مہاجرین میں ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے حق سے ایک مرلہ بھی زیادہ لینے کے حق میں نہیں تھے۔ ناول میں ایسے لوگوں کے نمائندہ کے طور پر یعقوب اعوان کے کردار کو سامنے لایا گیا ہے۔ یعقوب اعوان کو جب برادری کے مقامی چند لوگ زمین پر ناجائز قبضے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور مربعوں کی پیش کش کرتے ہیں تو وہ انتہائی سادگی سے جواب دیتا ہے:

''میری ساڑھے بارہ کلّے زمین ہے۔''(۱۷)

اس کے بعد عبداللہ حسین جعلی الاٹمنٹ کے عمل کو واضح کرتے ہیں کہ کس طرح لوگوں نے غریبوں اور حق داروں کا استحصال کر کے زمینیں اور جاگیریں ہتھیالیں۔ الاٹمنٹ کے عمل کے مراحل ملاحظہ ہوں:

> ''جتھا بنا کر جائیں گے، زمین پر بشن داس کے کمی بیٹھے ہیں انہیں ڈرا دھمکا کر دوڑا دیں اور قبضہ کر لیں گے۔ ساری دنیا کر رہی ہے۔''(۱۸)

قبضے کے بعد اس ناجائز قبضے کے لیے سرکاری سرپرستی حاصل کرنے کا طریقہ دیکھئے:

> ''فلک شیر اعوان مہاجرین کے محکمے میں ڈپٹی چیف کمشنر لگا ہوا ہے...........نور پور کے اعوانوں کو اس نے مہاجنوں کے امرودوں کا باغ الاٹ کرا کے دیا ہے کاغذ واغذ سب اپنے پاس سے بنا کر دیئے ہیں۔ برادری کا آدمی ہے ہل نہیں سکتا۔''(۱۹)

اور جب یعقوب اعوان اپنی ایمانداری اور دیانتداری کے سبب اسی خیانتی عمل میں شرکت کرنے سے انکار کرتا ہے اور مربعوں کی بجائے اپنے ساڑھے بارہ ایکڑ پر ہی اصرار کرتا ہے تو یہ خیانتی ٹولہ سرکاری املاک کو ہی رشوت کے طور پر استعمال کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے۔ وہ اعجاز کو کہتے ہیں:

''اب تو ہی اسے سمجھا۔ کاغذ کے بدلے آدھا مربع اس کے حصے سے اوپر دے دیں گے آدھی حویلی بھی تیرے نام کر دیں گے۔'' (۲۰)

جعلی الاٹمنٹ کے اس کاروبار نے شروع میں غریب لوگوں کو جو زک پہنچائی اس نے ان کی کسمپرسی کی رہی سہی کسر بھی نکال دی دوسری طرف جاگیرداروں نے جعلی لاٹمنٹ کے ذریعے بہتی گنگا میں خوب ہاتھ دھوئے اور خود کو پہلے سے بھی زیادہ مضبوط کر لیا۔ عبداللہ حسین نے اپنے ناولوں خاص طور پر نادار لوگ میں تاریخی حوالے سے قاری کو بہت سے گوشوں سے آشنائی دلائی ہے۔ فرد اور تاریخ کے تعلقات کے علاوہ زندگی میں درپیش دیگر بہت سے مسائل کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے۔ جس کی بڑی وجہ تاریخ کے بارے میں ان کا گہرا مطالعہ اور سماج کا گہرا مشاہدہ ہے۔ رضی عابدی لکھتے ہیں:

''عبداللہ حسین کے ہاں فرد اور تاریخ کا ٹکراؤ زندگی کو بہت پھیلاؤ سے دکھانے کی کوشش، فطرت سے خاص قسم کا رابطہ، فرد کی ذہنی اور داخلی مہاجرت اور بیگانگی، جرم و سزا کے تصورات غرض کہ فکر و فن کے بہت سے پہلوؤں کی توصیف ہوتی رہی ہے مگر ساتھ ہی بہت سے اعتراضات بھی ہوئے ہیں۔'' (۲۱)

''نادار لوگ'' پاکستان کی سیاسی تاریخ، ہجرت کے واقعات اور آزادی کے فوراً بعد ہونے والی جعلی الاٹمنٹ کی صورت میں کرپشن کے ساتھ پاکستانی معاشرے میں غریب اور محکوم لوگوں کے استحصال کو بھی سامنے لاتا ہے۔ اس ناول کے ذریعے عبداللہ حسین سماج کے پسے ہوئے طبقے کے استحصال اور ان کے مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ استحصال کی جو تاریخ اس ناول کے ذریعے سامنے لائی گئی ہے وہ حضرت موسیٰؑ کے دور میں فرعون اور اس کے کارندوں کے ذریعے بنی اسرائیل پر ہونے والے ظلم و ستم سے میل کھاتی ہے۔ ماضی میں غریب اور مفلوک الحال لوگوں کے استحصال پر نظر ڈالی جائے تو زرتشتی معاشرے میں غریب کسانوں اور پسے ہوئے طبقے کی جو صورت اور سماج میں ان کا جو مقام تھا پس نوآبادیاتی عہد میں بھی وہی روش برقرار ہے۔ زرتشتی معاشرے میں غریب کسانوں کی حالت زار بیان کرتے ہوئے سبطِ حسن لکھتے ہیں:

''کسانوں کی حالت عام شہریوں سے بہت بدتر تھی ان سے ہر طرح کی بیگار اور خدمت لی جاتی مگر زمین پر ان کا کوئی حق نہ تھا۔ جنگ کے موقع پر ان کو فوج میں زبردستی بھرتی کر لیا جاتا تھا مگر ان کو تنخواہ یا اجرت نہیں ملتی تھی۔ گویا ابدی غلامی ان کی تقدیر میں لکھی ہے۔'' (۲۲)

ابدی غلامی کا جو سلسلہ زرتشتی معاشرے میں غریب کا مقدر تھا پس نوآبادیاتی عہد میں بھی وہی اس کی تقدیر ٹھہرا، نادار لوگ میں عبداللہ حسین نے بھٹہ مزدوروں کے حالات زندگی کے بیان سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ بھٹہ پر کام کرنے والے مزدور بھی ابدی غلامی کے اسیر ہوتے ہیں۔ دن بھر کی بدن توڑ محنت و مشقت کے بعد بھی ان کو صرف دو وقت کی روٹی مشکل سے میسر آتی ہے ان کی تمام تر محنت اور ہنرمندی ''پیشگی'' کے کھاتے میں چلی جاتی ہے۔ پھر یہی پیشگی کی رقم ان کے لیے ابدی غلامی کا طوق ثابت ہوتی ہے:

''اس پیشگی کی رقم سے ان کے سارے کنبے کی زندگی کا سودا طے پاتا ہے۔پیشگی کی رقم کا تعین ہی اسی بنیاد پر ہوتا ہے کہ کنبے میں کتنے ہاتھ کام کرنے والے ہیں نہ عورت کا سوال نہ بچے کا، پانچ سال سے لے کر اَسی سال کی عمروں تک صرف ہاتھوں کی تعداد گنی جاتی ہے اور پیشگی طے پاتی ہے اگر مزدور ایک مالک سے تنگ آ کر دوسرے بھٹے پر جانا چاہے تو مالک اسے پیشگی کی پرچی بنا کر دے دیتا ہے۔دوسرا مالک پہلے کو پرچی کی رقم ادا کر کے مزدور کو بمعہ اہل وعیال خرید لیتا ہے۔مزدوری کا حساب یہ ہے جناب من، کہ ہر ہفتے مزدوری آدھی ملتی ہے، بقیہ آدھی پیشگی کے کھاتے میں کاٹ لی جاتی ہے۔اب آپ کا خیال ہوگا کہ کچھ عرصے کے بعد پیشگی کی رقم ادا ہو جائے گی؟ جی نہیں سال کے بعد پیشگی دُگنی ہو چکی ہوتی ہے۔''(۲۳)

پیشگی کی رقم اور خرید و فروخت سے جنم لینے والی یہ ابدی غلامی ہی نہیں بلکہ اس غلامی میں مزدور اور غریبوں سے جس طرح بیگار لی جاتی ہے وہ انتہائی سخت تکلیف دہ عمل ہوتا ہے۔دوسری طرف اس بیگار کے دوران ان کو بنیادی حقوق بھی میسر نہیں ہوتے۔تعلیم اور صحت جیسی چیزوں سے اُن کو ساری عمر آشنائی نہیں ہوتی۔ان کے شب و روز صرف اور صرف بھوک کا سامان کرنے اور پیشگی کی رقم اتارنے کی فکر و عمل میں گزرتے ہیں مگر پیشگی کی یہ رقم مرنے کے بعد بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی بلکہ باپ کے ذمے واجب الادا رقم بیٹے کو ادا کرنا پڑتی ہے یوں یہ تسلسل نسلوں کی غلامی کا باعث بنتا چلا جاتا ہے۔

جاگیردار اور صنعت کار کی طرف سے غریب طبقے کے استحصال کا ایک اہم ذریعہ ان کی اجرت مارنا ہے۔غریب اور مفلوک الحال لوگ سارا دن مسلسل کام کرتے رہتے ہیں جس سے سرمایہ دار اور صنعت کار اصل کام سے زیادہ ان کی محنت وصول کرتا ہے مگر اس فاضل محنت کا محنت کاروں کو کوئی صلہ نہیں ملتا۔آسان لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے کہ سرمایہ دار اور صنعت کاروں نے مزدوروں کے بارے میں ایسی پالیسیاں ترتیب دے رکھی ہیں کہ ان کو اپنی محنت اور اس کی اجرت میں نسبت کی بھی خبر نہیں ہوتی۔ سبطِ حسن کارل مارکس کے ایک بیان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ سرمایہ داری نظام میں ہر چیز بازار میں فروخت ہونے کے لیے تیار کی جاتی ہے۔یہ سب چیزیں محنت کشوں کی محنت سے پیدا ہوتی ہے لہٰذا ان میں قدر مشترک انسانی محنت ہوتی ہے۔محنت کاروں کو بازار کے بھاو سے جو اجرت ملتی ہے اس کے عوض وہ مقررہ وقت میں کئی گنا مالیت کا سامان تیار کر دیتے ہیں لیکن اس فاضل محنت اور فاضل پیداوار کا ان کو کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔یہی قدر فاضل صنعت کار کے نفع، ساہوکار کے سود اور زمین کے مالک کے لگان اور کرائے کی شکل میں سرمایہ دار طبقے میں بٹ جاتی ہے۔''(۲۴)

یوں دن رات کی مشقت کے باوجود مزدور اور غریب طبقہ نسلوں کی غلامی میں جکڑتا چلا جاتا ہے اور ان کی محنت کے عوض ساہوکار، جاگیردار اور صنعت کار طبقہ پہلے سے زیادہ خوشحال ہوتا چلا جاتا ہے۔''نادار لوگ'' میں بھٹہ مزدوروں سے جو بیگار لی جاتی ہے اس کی صورت حال بھی کچھ ایسی ہی ہے۔بھٹہ مزدور اپنا خون پسینہ ایک کر کے سرمایہ دار کی آمدن میں تو اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں جبکہ ان کی اپنی زندگیاں نہ صرف اسی ایک ہی ڈگر پر چلتی رہتی ہیں۔وہ اس حد تک ذہنی غلامی کا بھی شکار ہو جاتے

ہیں کہ اپنی محنت کی اجرت سے بھی بیگانہ ہوجاتے ہیں ۔ یہ بیگانگی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ اجرت لینے کو خرچہ لینے کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں ۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں سماج کا یہ طبقہ دن رات اپنا خون پسینہ ایک کرنے کے باوجود جب اجرت لینے جاتا ہے تو ان کے الفاظ یہی ہوتے ہیں کہ مالکوں سے خرچہ لینے جارہے ہیں ۔ ان کی جسمانی غلامی کے ساتھ ساتھ ذہنی غلامی کا یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہتا ہے ۔ سرمایہ دار جب چاہے انہیں ڈرادھمکا کر اور بعض اوقات تشدد کا راستہ اپنا کر بھی اپنے مقاصد کے لیے یوں استعمال کرتے چلے جاتے ہیں جیسے زرخرید غلام ہوں ۔ انسانوں کی خرید وفروخت کا جو قبیح عمل زمانہ جاہلیت میں جاری تھا بھٹہ مزدوروں کی زندگیوں میں آج بھی اس کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے ۔ ''نادارلوگ'' میں پاکستانی سماج کی جو تصویر کشی کی گئی ہے وہ عبداللہ حسین کو اردو ادب کی صفِ اول کے ناول نگاروں میں لاکھڑا کرتی ہے ۔ پولیس گردی اور جاگیرداروں کے ذریعے غریب عوام کو جس طرح ظلم و استحصال کا نشانہ بنایا جاتا ہے ۔ ''نادارلوگ'' میں اس کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے ۔ مجموعی طور پر نادار لوگ کو اردو کے ان نمائندہ ناولوں میں شمار کیا جاسکتا ہے جو تقسیم کے بعد کی سیاسی اور سماجی صورت حال کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں ۔

حوالہ جات

۱۔ محمد عاصم بٹ، عبداللہ حسین شخصیت اور فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء، ص:۹۹
۲۔ فیضان عارف، مضمون: عبداللہ حسین سے گفتگو، مشمولہ: جنگ، روزنامہ، راولپنڈی، ۱۳ جنوری ۱۹۹۷ء
۳۔ محمد علی، چوہدری، ظہور پاکستان، (ترجمہ بشیر احمد ارشد)، لاہور: مکتبہ کارواں، س ن، ص:۳۹۴
۴۔ فیض، احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، لاہور: مکتبہ کارواں، ص:۴۷۶
۵۔ فیضان عارف، مضمون: عبداللہ حسین سے گفتگو، مشمولہ: جنگ، روزنامہ، ۲ ستمبر ۱۹۹۲ء
۶۔ شہاب، قدرت اللہ، شہاب نامہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص:۶۹۳
۷۔ عبداللہ حسین، نادارلوگ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، بار پنجم، ۲۰۰۸ء، ص:۹۵
۸۔ ایضاً، ص:۹۶
۹۔ ایضاً، ص:۴۷۱
۱۰۔ ایضاً، ص:۴۷۳
۱۱۔ ایضاً، ص:۲۴۰
۱۲۔ ایضاً، ص:۱۷۱
۱۳۔ ایضاً، ص:۱۷۲
۱۴۔ محمد عاصم بٹ، عبداللہ حسین شخصیت اور فن، ص:۱۰۹
۱۵۔ عبداللہ حسین، نادارلوگ، ص:۲۶۷
۱۶۔ ایضاً، ص:۲۶۸
۱۷۔ ایضاً، ص:۸۴
۱۸۔ ایضاً، ص:۸۵

۱۹۔ ایضاً،ص:۸۵

۲۰۔ ایضاً،ص:۸۶

۲۱۔ رضی عابدی، تین ناول نگار، لاہور: سانجھ پبلشرز، اشاعت دوم، جنوری ۲۰۱۰ء، ص:۱۵۷

۲۲۔ سبطِ حسن، موسیٰ سے مارکس تک، کراچی، مکتبہ دانیال، اٹھارویں اشاعت ۲۰۱۴ء، ص:۱۰۳

۲۳۔ عبداللہ حسین، نادار لوگ، ص:۱۴۸

۲۴۔ سبطِ حسن، موسیٰ سے مارکس تک، ص:۱۴

☆......☆......☆